شہر آشوب

مع مقدمہ و حواشی

مرتبہ

ڈاکٹر نعیم احمد

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی
1968

کامل مرزا باقر علی خاں (۱) تمام گلشنِ عیش و سرور تھی دہلی ۳۳۴
(۲) مٹ گیا پر نہ مٹا نام و نشانِ دہلی ۳۳۷
کوکب تفضل حسین نہ رہا نام کو بھی نام و نشان دہلی ۳۳۸
مبین حافظ غلام دستگیر (۱) پسند خاطرِ ہر خاص و عام تھی دہلی ۳۳۹
(۲) دلِ غنی رکھا سخاوت پہ نہ زر والوں نے ۳۴۵
(۳) یہ نئی ہے گردشِ چرخِ کہن ۳۴۸
(۴) ہوئے دفن جو کہ ہیں بے کفن انہیں روتا ابرِ بہار ہے ۳۵۰
مجروح میر مہدی (۱) حرف تم اپنی نزاکت پہ نہ لانا ہرگز ۳۵۲
(۲) وہ کہاں جلوۂ جاں بخشِ بتانِ دہلی ۳۵۴
محسن حکیم محمد محسن خاں (۱) دیارِ ہند میں یہ تخت گاہ تھی دہلی ۳۵۶
(۲) وہ پری چہرہ ہوئے قتل میانِ دہلی ۳۶۳
منیر سید اسمٰعیل حسین دل تو پژمردہ ہے داغِ غمِ گلستاں ہوں تو کیا ۳۶۵
مہدی سید مہدی حسین رات دن لب پہ نہ ہو کیوں کہ بیانِ دہلی ۳۶۹
ہنر مرزا سچے تھے ہنر ہم سببِ عظمت و شانِ دہلی ۳۷۱

متفرقات

تجلی میاں حاجی وہ وقت آیا کہ محشر کی طرح دورِ فلک ۳۷۳
شہر آشوب گلہ میں کیا لکھوں یارو فلک کی نارسائی کا ۳۷۷
بیاض کشکول م ن ۳۷۵۳ اس دور کے امیر عجب ان کا حال ہے ۳۸۶
بیاض م ن ۸۷۲ از قبلِ ازل آپ کو ہی داورِ داوار یا حیدرِ کرار ۳۹۰

مقدمہ

شہر آشوب ایک ایسی کلاسیکی صنفِ سخن ہے جو اُردو کے علاوہ فارسی اور ترکی میں بھی موجود ہے۔ فارسی اور ترکی شہر آشوبوں میں کسی شہر، وہاں کے باشندوں اور ان میں بھی زیادہ تر پیشہ وروں کے نوعمر لڑکوں کی خوب صورتی کا ہزلیہ انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ لیکن اُردو شہر آشوب کی معنوی روایت، اس کا مزاج اور اس کی فضا فارسی اور ترکی نظموں سے بحیثیتِ مجموعی بالکل مختلف ہے۔

اُردو شہر آشوب کا آغاز اٹھارہویں صدی کے شروع میں ہوا۔ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد ہر طرف زوال و ادبار کے مہیب سائے منڈلانے لگے۔ چنانچہ جو صنفِ سخن فارسی اور ترکی میں ذہنی انبساط کے حصول کے لئے مخصوص تھی وہ اُردو میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی اختلال کے بیان کا ذریعہ بن گئی۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شہر آشوب اُردو کی وہ کلاسیکی صنفِ سخن ہے جس میں ہیئت کی کسی خاص پابندی کے بغیر سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی بحران کی وجہ سے

عوام و خواص کی بربادی کا حال بیان کیا گیا ہے۔

یہ شہر آشوب دہلی، اودھ، بہار، اکبرآباد، حیدرآباد اور روہیل کھنڈ سے متعلق ہیں۔ اردو کی پہلی آشوبیہ نظم کا مصنف میر جعفر زٹلی (متوفی ۱۷۱۳ء) ہے اُس کے بعد شاکر ناجی، ظہورالدین حاتم، مرزا محمد رفیع سودا اور میر محمد تقی میر وغیرہ کا نمبر آتا ہے اور آشوب گوئی کا یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء کے چند برس بعد تک جاری رہتا ہے[لہ]۔

شہر آشوب کے اس جائزے کو دو حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے!

(i) ۱۸۵۷ء سے قبل کی کیفیت (ii) ۱۸۵۷ء کی صورتِ حال

(i) ۱۸۵۷ء سے قبل کی کیفیت

آخری مُغل بادشاہوں کی نااہلی

شہر آشوب میں اورنگ زیب کے جانشینوں کی فرائض و آدابِ سلطنت سے

[لہ] اس غالب رنگ کے برخلاف اُردو میں جو ہزلیہ شہر آشوب مل سکے ہیں ان کی تعداد صرف چار ہے۔ یہ نظمیں پیر خان کمترین، مرزا جعفر علی حسرت، مرزا محمد تقی ہوس اور نواب یوسف علی خان ناظم کی لکھی ہوئی ہیں۔ کمترین کی نظم میں پیشہ وروں کی ہزلیہ انداز میں مذمت کی گئی ہے؛ حسرت نے پیشہ وروں کے نوجوان لڑکوں کے حسن اور ان کی اداؤں کا بیان کیا ہے؛ ہوس نے ہزلیہ انداز میں شراب و شباب کی تعریف کی ہے اور ناظم نے طوائفوں کی قسموں اور ان کی حرکتوں کا ذکر کیا ہے۔

واقفیت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ بات اس حقیقت کی مظہر ہے کہ شخصی حکومت کے اس دور میں بھی ہمارے شعرا میں اتنی اخلاقی جرأت تھی کہ وہ بادشاہ کی کوتاہیوں پر بھی نکتہ چینی کر سکتے تھے۔ قائم کی نظم اس بات کی نمایاں مثال ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں جہاندار شاہ، عالمگیر ثانی اور شاہ عالم ثانی کو نااہل قرار دیا ہے۔ اسی طرح امرائے سلطنت کی ناکارکردگی کے بارے میں سودا نے لکھا ہے:

جو مصلحت کے لیے جمع ہوں صغیر و کبیر   تو ملک و مال کا فکر اس طرح کریں ہیں مشیر
وطن پہنچنے کی سوجھی ہے بخشی کو تدبیر   کھڑا یہ اٹکلے دیوانِ خاص بیچ وزیر
کہ شامیانے کے بانسوں پہ نقرئی ہیں خول

اس قسم کے امرا کا واحد مشغلہ لذت کوشی اور غیر صحت مند حرکتوں میں دلچسپی لینا تھا۔ چناں چہ اخلاقی بے راہ روی اس وقت کی ایک نمایاں سماجی خصوصیت ہے۔ یہ لوگ گھٹیا سے گھٹیا مذاق سے لطف اندوز ہوتے اور شرم ناک سے شرم ناک حرکتوں کی داد دیتے۔ یہ بے صلاحیت امیر عہدوں کی تقسیم میں اہلیت اور صلاحیت کے بجائے، ذاتی اغراض و مقاصد اور اپنی انا کی غلط تسکین پر زور دیتے۔ اس لیے ان کے حاشیہ نشین اور درباری ناکارہ اور سماج دشمن افراد تھے۔ اس ذہنی رجحان اور اس غلط منصوبہ بندی سے پیدا شدہ خرابیوں کے خلاف اس انداز میں ناگواری کا اظہار کیا گیا ہے:

چار لُچے ہیں مستعدِ کار   دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خوار   لوٹ سے کچھ ہے گرمیِ بازار
سو بھی قندِ سیاہ ہے یا ماش

(میر)

اوران سے رکھتے ہیں اُن ات اپنی یہ صحبت   نہ شرم گالی کی جن کو نہ مار کی غیرت
جو شخص اہلِ معانی ہیں، ان سے ہے نفرت   جب ایسے لوگ ہوں اس جا پہ صاحبِ ثروت
تو کیوں نہ عاقل و دانا سدا رہیں بے کار

(کمالؔ)

سیاسی ابتری

اس صورتِ حال کے سبب سے شدید سیاسی ابتری اور زبردست بدامنی کا دور دورہ تھا۔ قتل و غارت گری، لوٹ مار اور چوری ڈاکے سے لوگوں کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ جن لوگوں پر شہری نظم و نسق بحال رکھنے کی ذمے داری تھی وہ خود جرائم میں مشغول تھے۔ خود دلی کے قرب میں جو صورتِ حال تھی اسے مصحفی نے ان اشعار میں بیان کیا ہے:

اطراف میں دلی کے لٹھ ماروں کا ہے شور   جو آوے ہے باہر سے وہ بشکستہ دہاں ہے
اور پڑتے ہیں راتوں کو جو نت شہر میں ڈاکے   باشندہ جو واں کا ہے بفریاد و فغاں ہے
اتریں ہیں وہاں پگڑیاں بس شام کے ہوتے   چالاکیِ دست ایسی یہ اندھیر کہاں ہے

رشوت کی گرم بازاری

دربار، کوتوالی اور عدالت میں رشوت ستانی کا بازار گرم تھا۔ بعض شعراء نے رشوت کی علی الاعلان طلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بات ظاہر کی ہے کہ اس دور میں قانون اور انصاف ایک ڈھکوسلا بن گیا تھا۔ مثلاً

در پہ عمدوں کے روز و شب شر و شور   صرف یک سر فریب و رشوت خور
بے لیے دیکھیں نے کسو کی اور   مردہ شو، پر وہ سب کفن کے چور

رحمۃ اللہ بر اوّلیں نبّاش

(میرؔ)

شاہی گھرانے کی خستہ حالی

آشوب نگاروں نے مختلف طبقوں کی خستہ حالی کا جو ذکر کیا ہے اس میں بھی وضاحت اور پُرگوئی کے ساتھ درد و اثر کا عنصر موجود ہے۔ اس طوفانِ بلا میں خود شاہی گھرانے کے افراد کی زندگی ذلت و خواری کا روح فرسا نمونہ تھی۔ ناز و نعم، شوکت و حشمت، جاہ و جلال اور عزت و مرتبت کے بجائے بے بسی و لاچاری اور فقر و فاقہ ان کا مقدر بنا ہوا تھا:

مچا رکھی ہے سلاطینوں نے یہ توبہ دھاڑ   کوئی تو گھر سے نکل آتے ہیں گریباں پھاڑ
کوئی در اپنے پہ آ، دے دے مارتا ہے کواڑ   کوئی کہے، جو ہم ایسے ہیں چھاتی ہی کے پہاڑ
تو چاہیے کہ ہمیں سب کو زہر دیجے گھول

(سوداؔ)

احوالِ سلاطین لکھوں کیا کہ اب آہ   یعنی کہ مہِ عید اب ان کو لبِ ناں ہے
فاقوں کی زبس مار ہے بیچاروں کے اوپر   جو ماہ کہ آتا ہے وہ ماہِ رمضاں ہے

(مصحفیؔ)

جن امیروں کے پاس آمدنی کے کچھ ذرائع باقی رہ گئے تھے، ان کے لیے بھی شان و شوکت کی زندگی گزارنا تو کیا اپنے نوکروں کی تنخواہ ادا کرنا بھی ممکن نہیں تھا چناں چہ ان کی سواری انتہائی بے سر و سامانی کی حالت میں نکلتی۔ احسانؔ لکھتا ہے کہ اب امیر کی پینس اور جنازے کے چھپر کھٹ میں کوئی فرق نہیں رہا:

سواری ان کی نکلتی ہے جب بحالِ تباہ   نہ دورباش پکارے نہ کوئی پیش نگاہ
جلو میں ان کے جو ہیں چوب دار، بھر کر آہ   پکاریں اَشْہَدُ اَن لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ
جنازہ سمجھے ہیں پنیس کو ان کی خاص و عام

فوجی لشکروں کی تباہی

جاگیرداری نظام میں ہزاروں انسانوں کی معیشت ایک فرد سے وابستہ ہوتی تھی۔ کسی امیر کی بربادی اس کے متوسلین کے لیے بھی تباہی کا پیغام بن کر آتی۔ شہر آشوب مغل بادشاہ اور امیروں کی افواج کی بربادی کا ذکر بہت پُر اثر انداز میں کیا گیا ہے۔ ان شعرا نے لکھا ہے کہ فوجیوں کے پاس عام طور پر زیادہ سے زیادہ ناکارہ فوجی ہتھیار اور جانور رہ گئے تھے۔ ان بیانات سے طوائف الملوکی کے عسکری اسباب کا پتا چلتا ہے۔ چناں چہ یہ ننگے، بھوکے اور بڑی حد تک غیر مسلح فوجی ملکی سرکشیوں یا غیر ملکی حملہ آوروں کا جو مقابلہ کر سکتے تھے، اس کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ درگاہ قلی نے جو آصف اول صوبہ دارِ دکن کے ساتھ نادر شاہ کے حملے کے وقت دلّی آیا تھا اور اسی طرح دوسری کچھ مہموں میں بھی شریک رہا تھا، اپنا تجربہ اس قطعی انداز میں نظم کیا ہے:

اسیرِ پنجۂ تعذیب صامت و ناطق   غریقِ لُجّۂ تخریب ہے گا سب لشکر۔۔
نہیں ہے تختۂ بازار پر اناج کی جنس   نہ غلہ بلکہ سبھی نقد و جنس ہے کمتر
گیہوں کی جنس ہے نایاب مثلِ آدمِ خوب   مثالِ ہُن نظر آتی نہیں اب تو ہر ر۔
خراب حال ہوا ہے دواب بے حساب   زبون، خستہ و مجروح، لنگ اور لاغر

اسی طرح اشرف علی فغاںؔ نے جو احمد شاہ بادشاہ کا دودھ شریک بھائی تھا اور جسے تلاشِ معاش میں لکھنؤ اور عظیم آباد کی خاک چھاننا پڑی تھی، اپنے

مشاہدات کو اس بے اختیارانہ انداز میں پیش کیا ہے:

اعلیٰ سے تابہ ادنیٰ جتنے ہیں گرسنہ ہیں   لشکر ہیں ہو گئے ہیں بے اعتبار فاقہ
کہتا ہے ساربان تو میں کس شتر کو لاؤں   ہوں ایک دو بلا سے، ساری قطار فاقہ
شاہ و گدا کی حالت یکساں ہے میرے صاحب   تنخواہ دار بھوکے، روزینہ دار فاقہ
بندے سبھی خدا کے کہتے پھرے ہیں الجوع   آگے فغاںؔ کہوں کیا، سارا دیار فاقہ

فوجیوں کی پریشانیاں

اقتصادی پریشانیوں کی وجہ سے فوجیوں کو شدید ذہنی اذیتوں اور بے پناہ مجبوریوں کا سامنا تھا۔ ان لوگوں میں بیزاری، خواری اور ذلّت کا زبردست احساس پیدا ہو گیا تھا۔ فوجیوں کی جو حالت تھی اس کی بعض شعرا نے عمدہ عکاسی کی ہے۔ چند اشعار مثال کے بطور نقل کیے جاتے ہیں:

ہم نام کوں اسوار ہیں، روزگار میں بیزار ہیں   یارو ہمیشہ خوار ہیں، یہ نوکری کا حظ ہے
(زٹلیؔ)

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی   تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ نشاں ہے
(سوداؔ)

سپاہی جو ہے تیرِ غم کا نشاں   کمر ہے دوتا اس کی مثلِ کماں
صعوبت سے طاقت ہے نت اس کی طاق   کہاں ہے گا مرکب، کہاں ہے یراق
(راغبؔ)

قرض خواہوں کے ہاتھوں بے عزّتی

معاشی اختلال کے اس دور میں مال گروی رکھنا ایک اقتصادی ضرورت

بن گیا تھا۔ بعض شہر آشوب گو شعرا نے یہ بات بتائی ہے کہ مال گردی رکھنے والے بنیوں کے ہاتھوں لوگوں کو ایک اور معاشی استحصال کا سامنا تھا... مثلاً کمال لکھتا ہے:

گھروں میں ان کے جو جا کر بغور کیجے نظر   تو گھر میں کیا ہو جہاں ہو نہ پھوس چھپر پر
قبائلوں کے نہ سر پہ ردا، نہ ہے زیور   نہیں کچھ ہاتھ میں چھلے سے تا بہ انگشتر
سب ان کا مال قرض داروں نے لیا ہے اتار

پیشہ وروں کا حال

اس صنفِ سخن سے پیشہ وروں کی بے کاری اور مفلسی کا احوال سامنے آتا ہے۔ کچھ شعرا نے بزاز، بساطی، بقال، بھڑ بھونجے، تنبولی، دُھنیے، عطار، قصاب، کبابی، کنجڑے، مفرح فروش اور نانبائی وغیرہ کا کام نہ چلنے کا ذکر کرتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ لوگوں میں روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں خریدنے کی بھی استطاعت تک نہیں رہی تھی۔

دیگر پیشہ وروں کی طرح دست کاروں اور صنعت کاروں کی حالت بھی بہت خراب تھی۔ نظیر نے چھتیس ٣٦ پیشے والوں کی بے کاری پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ ان میں لوہار، سُنار، رنگریز، کمان گر، صحاف، بٹیے، تارکش مشروع دارائی، ازار بننے والے اور کاغذی شامل ہیں۔ راغب نے بھی اپنی نظم میں پیشہ وروں کی خستہ حالی پر زور دیا ہے۔ وہ لوہار اور رنگریز کی حالت کے بارے میں کہتا ہے:

زمانے کا کھینچے ہے رنج و تعب   لُہار آہن سرد کوٹے ہے اب
زبس اس کو بے کاری کا درد ہے   بہت چہرہ رنگریز کا زرد ہے

اسی ضمن میں حجام کی بے کاری کا ذکر بھی ہے۔ کام نہ چلنے کے سبب سے حجام کے آلات کا کند ہو جانا اور کوئی گاہک آ نکلنے پر، اس کا سر بھگوتے ہوئے جسمانی کمزوری کی وجہ اس کو کپکپی لگ جانا ایسے معنی خیز اشارے ہیں جو تباہ حالی اور فاقہ زدگی کے اس بیان کا ناقابل تردید اور انتہائی موثر ثبوت ہیں۔ نظیر نے لکھا ہے:

حجام پر بھی یاں نہیں ہے مفلسی کا زور   پیسہ کہاں جو سان پہ ہو استروں کا شور
کانپے ہے سر بھگوتے ہوئے اس کی پور پور   کیا بات ایک بال کٹے یا تراشے کور
یاں تک ہے استرے و نہرنی کی دھار بند

اربابِ علم و ہنر کی خواری

اس عام معاشی، بدحالی کی وجہ سے علم و ہنر کی سرپرستی کسی کے لیے ممکن نہ رہی تھی۔ اربابِ علم و فضل اور اہلِ کمال جو ملک کی مجموعی اعتبار سے، اچھی اقتصادی حالت کے دنوں میں نامور اُمرا تو کیا بادشاہوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ راسخ کے دو شعر مثال کے طور پر درج کیے جاتے ہیں۔

ہنرمند کا ہے جگر ریش ریش   نہیں جاتا اب کوئی پیشہ بھی پیش
گدائی کا کاسہ لیے در بدر   ہیں آوارہ اربابِ فضل و ہنر

مصاحبت، معلمی اور طبابت بڑے باوقار پیشے سمجھے جاتے تھے۔ اُمرا آسودہ حالی میں مصاحب رکھتے تھے اور مخصوص صلاحیتوں کے لوگ اسے اختیار کیا کرتے تھے۔ لیکن اب اس پیشے میں کوئی وقعت نہ رہی تھی اور مفلسی کی وجہ سے امیر مصاحب رکھتے بھی نہیں تھے۔ سودا، راغب اور راسخ نے اپنی نظموں میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔

معلمی میں جو ذلتیں اور اذیتیں تھیں ان کا سودا ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے:

ملائی اگر کیجیے، ملا کی ہے یہ قدر   ہوں دو روپے اس کے جو کوئی مثنوی خواں ہے
اور ماحضر اخوند کا اب کیا میں بتاؤں   یک کاسہ دال عدس و جو کی دو ناں ہے
دن کو تو بیچارا، وہ پڑھایا کرے لڑکے   شب خرچ لکھے گھر کا، اگر ہندسہ داں ہے

طبیبوں کو اکثر نوکری ہی نہ ملتی۔ اگر کسی کو نوکری مل بھی جاتی تو سودا اور راسخ کے بیان کے مطابق اس کو ہزار طرح کی بے عزتی سہنا پڑتی۔ حسرت لکھتا ہے کہ بہت سے تو مجبوراً طبیب سے کحال بن جاتے:

وہ جو کہ فنِ طبابت میں ہیں ارسطو رائے   انہوں نے دیکھا غذا ہوتے تب دوا کو کھائے
مرض ہے جوعِ بقر کا، سو کس طرح سے جائے   وہ چھوڑ طب کو تہیں اب جو کچھ خدا دکھائے
سلائی سرمے بازار میں، بنے کحال

حسرت، ہدایت اور نظیر نے اسی انداز میں نجومیوں کی پریشانیاں بیان کی ہیں۔

فنکاروں کا حال

معاشی بدحالی میں فنونِ مفیدہ کی سرپرستی ممکن نہیں رہی تھی تو فنونِ لطیفہ کو کون پوچھتا۔ مصوری، نقاشی، مینا کاری، خطاطی اور کتابت وغیرہ کو ذریعہ معاش بنانے والے فنکار کس مپرسی کا شکار تھے۔ سودا، حسرت، راغب، ہدایت، نظیر اور راسخ کی نظموں میں ان کے دکھوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ مثلاً راغب خطاط کی حالت اور خطاطی کی بے قدری کے مضمون کو اس طرح پیش کرتا ہے:

جواہر رقم شاہ نامہ اگر   لکھے دل لگا کر بہت سر بسر

جو بیچے اسے چوک کے درمیان   اور آٹھ آنے اس کے کوئی قدرداں
لگا دے، تو اس سے کہے دوسرا   گراں ہے یہ اتنے پہ کرتے ہو کیا

شاعری فن کے علاوہ آمدنی کا ایک موثر ذریعہ تھا۔ باکمال شعرا کی تعظیم و تکریم کی جاتی اور روپیے پیسے سے ان کی مدد کرنا تہذیبی فرض اور باعثِ شرف سمجھا جاتا۔ چناں چہ شعرا قصیدے ہی نہیں، ہجو پر بھی انعام پاتے لیکن بدلے ہوئے حالات میں انہیں اپنے فن کو معیشت کا براہ راست ذریعہ بنانا پڑا۔ ان ہنرمندوں کی مذلت و خواری کا سودا، حسرت، راغب، جان صاحب اور راسخ کی نظموں میں تذکرہ موجود ہے۔ مثلاً حسرت اور جان صاحب نے اس سلسلے میں اپنے تاثرات اس انداز میں نظم کیے ہیں:

جو شعر کہتے تھے سو فکرِ قوت میں ہیں اسیر   صلہ تو دے وے نہ سن مدح، بادشاہ و وزیر
مگر کہ ہجو کہیں، سو رکھے نہ ننگ امیر   مریں تو مرثیہ کہنے کی رکھتے ہیں تدبیر
کہ نان و حلوا کا آکر انہیں بندھا ہے خیال

(حسرت)

منہ سور کی طرح ہن ہن کے بنائیں شعر پر   شعر کی شاعر سند دے کے کرے جھوٹا اگر
بحر میں پھر گفتگو کرنے لگیں پہروں وہ خر   قافیہ ہو تنگ اس میں بھی تو قصہ مختصر
گالیاں بدلے صلے کے ہوں عنایت آج کل

(جان صاحب)

نظیر اور راغب کی نظموں میں رقص و نغمہ کے ماہروں کی سقیم حالت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ فن کاروں کا مسلسل بے کاری کی وجہ سے اپنے فن کے قاعدے اور آداب بھول جانا اور ان کے آلاتِ موسیقی کی خرابی ایسے نکتے ہیں جن میں معنی کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ یہ بیانات اس وقت ثقافتی

مشغلوں کے تقریباً ختم ہوجانے پر دلالت کرتے ہیں۔ راغب کہتا ہے:

کہے ہے یہ مطرب ہر ایک سے پکار   نہیں میرے تنبورہ پر ایک تار
کسو بزم میں کوئی مطرب جو جائے   تو ڈھولک کی جا پیٹ اپنا بجائے
ہوا ہوش ان کا جو تاراج و تاخت   نہیں راگ کی ان کو بالکل شناخت
کدارے کو سارنگ کے وقت گائیں   کوئی گائے بھیروں تو ایمن بتائیں

مذہبی رہنماؤں کا حال

اس معاشی انحطاط کا مذہبی رہنماؤں پر بھی اثر پڑا۔ ان لوگوں کا معاش کے لیے حیران پریشان ہونا بتاتا ہے کہ اس اقتصادی بحران سے کسی کو مفر نہیں تھا۔ سودا، حسرت، نظیر اور راسخ کے اس نوعیت کے اشعار میں سے راسخ کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:

گئے سارے ورد و وظائف کو بھول   کیا ایسا فکرِ شکم نے ملول....
کہ اسم الٰہی سے دے دل دو نیم   زباں پر نہیں رکھتے جز یا حلیم
لبوں پر انہوں کے اگر کیجے غور   بجز نان و حلوا نہیں ذکر اور
وظیفہ ہے ہر آن اب صرف قوت   کیے دانہ تسبیح کے صرفِ قوت

نئے دولت مندوں کی مذمت

اس دور میں تاریخ کی جبریت کے فیصلوں کے مطابق گنتی کی چند ایسی صورتیں بھی وقوع پذیر ہوئیں کہ کبھی کبھی بعض "رذیلوں" کو کچھ اقتدار حاصل ہوگیا یا کچھ سر و سامان میسر آگیا۔ "شرفا" ایسی حالت کو زمانے کی قدریں زیر و زبر ہوجانے سے تعبیر کرتے۔ وہ نئے دولت مند اور با اثر افراد سے تعاون کو نہایت

ذلت کی بات سمجھتے اور ان کی بری طرح مذمت کرتے تھے۔ حاتم، جوہری، آصف، تجلی، مصحفی، نظیر، کمال اور جرأت نے اپنی نظموں میں اسی ذہنی رجحان کی عکاسی کی ہے۔ م ن ۸۷۲ اور م ن ۳۷۵۳ میں بھی یہی نقطۂ نظر کارفرما ہے۔ کمال نے اپنی نظم میں لکھا ہے:

نہ بار جن کے جلو خانے تک تھا یہاں جن کو   خدائی ہے کہ وہ ترسے ہیں ان کے مجرے کو
جب انقلاب زمانے کا یک بیک یوں ہو   تو کہیے کیوں کہ نہ پاجی پرست پھر ان کو
امیر ہوویں فقیر اور رذلے ہوں زردار

گزشتہ سطور میں یہ بات کہی جاچکی ہے کہ اس وقت ضرورت اور خاص طور پر فن کاروں کی سرپرستی کرنا آدابِ امارت میں داخل تھا۔ ان نئے دولت مندوں کو کچھ شعرا نے اس وجہ سے بھی برا کہا ہے کیوں کہ ان سے انہیں کوئی فیض نہیں پہنچتا تھا۔ اس قسم کے بیانات کے مجموعی جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ "عیب" اس وقت کے پشتینی امرا میں بھی تھا۔ مندرجہ ذیل اشعار کا لب و لہجہ اس کا ثبوت ہے:

چار دن کی چاندنی کی سیر لازم ہے اجی   لے گیا قارون کب ساتھ اپنی دولت مدعی
اے غنی خاں شوم کے بھی باپ ہیں اکے دنی   ماریں جھوٹے ہاتھ بھولے سے نہ کتے کے کبھی
نام سے مجھ کو نہ کیوں ہو ان کے نفرت آجکل

(جان صاحب)

سردارِ عالی شاں جو ہیں ہندستان کے   نیت ہوئی ہے ان کی یہاں تک باختصار
دریائے فیض وجود، جو تھا مطبخِ حضور   خلقِ خدا تھی جس کی بدولت وظیفہ خوار
اس مطبخِ عظیم کی یہ شکل اب بنی   دیگ دان میں گرتے ہیں گھبرا کے مور و مار
مطبخ کا خرچ ٹھہرا ہے کل سترہ ٹکے   تحصیلِ نو پر اوس کا بھی ہوتا ہے پھر گزار

(عیشی)

دِلّی شہر کی بربادی

اس صنفِ سخن میں انسانوں کی بربادی کے علاوہ شہروں کی تباہی کے واقعات بھی نظم ہوئے ہیں۔ دلّی کی خوب صورت سڑکیں اور گلیاں، دل کش نہریں، پُرکشش باغات اور حسین عمارتیں آپ اپنی نظیر تھیں۔ اس کی ویرانی کے بارے میں سوداؔ نے لکھا ہے:

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس   کہ جن کے دیکھے سے جاتی رہے تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اُداس   بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے، کہیں پڑے مرغول

اکبر آباد کی تباہی

نظیرؔ نے اپنی نظم میں اکبر آباد کے ویران ہو جانے پر دُکھ کا اظہار کیا ہے۔ اپنی نظم کے ایک بند میں وہ کہتا ہے:

ہیں باغ جتنے یاں کے سو ایسے پڑے ہیں خوار   کانٹے کا ان میں نام نہیں، پھول درکنار
سوکھے ہوئے کھڑے ہیں درختانِ میوہ دار   کیاری میں خاک دھول، روش پر اُڑے غبار
ایسی خزاں کے ہاتھوں ہوئی ہے بہار بند

صُوبۂ بہار کے مختلف شہروں کی تباہی

صوبۂ بہار کے شہروں پٹنہ، مظفرپور، آرہ اور چھپرہ کی تباہی کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے:

گلستاں تھا آگے جو ملکِ بہار   سودوزاں نے اس کو کیا خوار وار

مظفّرپور اب ہے کسو کا مقرّ   کہ شاید ظفر پاوے افلاس پر
کوئی جا کے آرے یہ رو رو کہے   کہ آرے چلے سر پہ افلاس کے
کوئی چھپرے میں کھوے ہے روز و شب   کہ چھپّر پہ باقی نہیں پھوس اب
(راغب)

(ا) ۱۸۵۷ء سے متعلق نظموں کی خصوصیات

۱۸۵۷ء ہندستان کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ تھا۔ اس باب میں جو شہر آشوب ملے ہیں ان میں زیادہ تر دہلی والوں کی داستانِ غم کا بیان ہے۔

بہادر شاہ ثانی کی معزولی پر اظہارِ افسوس

لارڈ لیک نے ۱۸۰۳ء میں دہلی پر قبضہ کیا تھا۔ چناں چہ یہاں تقریباً چوّن ۵۴ برس سے انگریزی عمل داری تھی۔ لیکن ملک کے دوسرے مقبوضہ علاقوں کی طرح دہلی والوں کی بہت بڑی تعداد انگریزی نظم و نسق سے ذہنی توافق پیدا نہیں کر سکی تھی۔ مغل بادشاہ کی برائے نام سیاسی حیثیت تھی مگر لوگ اس سے شدید وابستگی رکھتے[1] تھے اور لال قلعہ اپنی سابقہ شان و شوکت کھو دینے

---

[1] دہلی میں ایسے لوگ بھی تھے جو شاہی خاندان کی ناروا باتوں کی وجہ سے اس کی سخت مذمت کرتے تھے۔
دیکھئے: اسبابِ بغاوتِ ہند، سید احمد خاں، ص ۳۶ —— ۳۷
آزردہؔ نے اس ناگواری کو اپنے شہر آشوب میں اس طرح ظاہر کیا ہے:
آفت اس شہر میں قلعے کی بدولت آئی   واں کے اعمال سے دِلی کی بھی شامت آئی

کے باوجود ثقافتی زندگی کا مرکز تھا۔ اسی لیے بعض شہر آشوبوں میں مغلیہ خاندان کے خاتمے اور لال قلعے کے اُجڑنے پر رنج اور افسوس کا اظہار ملتا ہے۔ اس ضمن میں تشنہ، سوزاں، عیشی اور کامل کی نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔ سوزاں کو یہ بساط اُلٹ جانے پر جو دُکھ ہوا تھا اُس کا اس بند سے اندازہ ہو سکتا ہے:

کہاں وہ تاج کا مالک کہاں ہے وہ دربار   کہو کدھر گئی دیوانِ خاص کی وہ بہار
اب اس کے دیکھے جو اُجڑے ہوئے در و دیوار   یہ دل میں آئی کہ سر پھوڑ اور چیخیں مار
ہے پارہ پارہ جگر، کیسی دل فگاری ہے
بجائے اشک جو آنکھوں سے خون جاری ہے

قتلِ عام کا بیان

انگریزوں نے دہلی کو دوبارہ فتح کرنے کے بعد بدترین درندگی اور بربریت کا مظاہرہ کیا تھا[1]۔ بعض شعرا نے قتلِ عام کا بہت رقت آمیز اور دلگداز پیرائے

---

[1] ایک انگریز مصنف رابرٹس نے اپنی تاریخ "چہل وکیسالہ" میں اس غارتگری کا یوں نقشہ کھینچا ہے: "ہم صبح کو لاہوری دروازے سے چاندنی چوک میں گئے تو ہم کو شہر حقیقت میں مُردوں کا شہر نظر آتا تھا۔ کوئی آواز سوا ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں کے سنائی نہیں دیتی تھی۔ کوئی زندہ آدمی نظر نہیں آیا۔ سب طرف مُردوں کا بچھونا بچھا ہوا تھا جس میں حالتِ نزع کی ہر وضع نظر آتی تھی... اس بات کے دیکھنے سے کہ ایک طرف مُردوں کی لاشوں کے اعضا کتے بھنبھوڑ کے کھا رہے ہیں، دوسری طرف لاشوں کے گرد گدھوں کے جھنڈ ان کے گوشت کا مزہ لے رہے ہیں... ہم کو بڑی عبرت ہوتی تھی..."
بحوالہ: تاریخ بغاوتِ ہند مصنفہ نامعلوم ص ۷۷

میں ذکر کیا ہے۔ ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا خاندان ہو جس کا کوئی نہ کوئی فرد مارا نہ گیا ہو۔ بہت سے گھرانے تو ایسے تھے جن کا نام و نشان مٹا دیا گیا تھا۔ مبین، ظہیر، غالب، داغ، محسن، سالک، عیش اور کوکب کی نظموں میں اس اندوہناک حقیقت کا بیان موجود ہے۔ مثلاً ظہیر کہتا ہے:

ہر ایک رونقِ بزمِ جہان قتل ہوا   ہر ایک قبیلہ و ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک طوطیِ شیریں زبان قتل ہوا   ہر ایک بلبلِ نوشیں بیان قتل ہوا
گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے، نہ کفن ہے، نہ رونے والے ہیں

اسی قیامتِ صغریٰ میں بے شمار اربابِ علم و فضل، فن کار اور کاری گر موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ اور بہت سے لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ سید کمال الدین حیدر کے بیان کے مطابق "... ۲۷ ہزار اہلِ اسلام نے پھانسی پائی۔ سات دن تک قتلِ عام رہا، اس کا کوئی حساب نہیں[1]۔" تشنہ اس سلسلے میں لکھتا ہے:

یہاں جو آن کے دیکھی تو دار کی صورت   وہ دار کہیے جسے ذوالفقار کی صورت
مٹا دی چشم زدن میں ہزار کی صورت   نظر پڑی نہ کسی بے قرار کی صورت
برنگِ نیرِ شہاب آگ میں جلے لاکھوں
سپردِ دار و رسن ہو گئے گلے لاکھوں

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۴۵۴

دہلی والوں کا شہر بدر کیا جانا

دہلی کے فوجی گورنر نے لوگوں کو شہر سے باہر نکال دینے کا حکم دیا جس کی بڑی سختی سے تعمیل کی گئی۔ غالبؔ نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

> "مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے وہ نکالے گئے۔ جاگیر دار، پنشن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ کوئی بھی نہیں .... غرضکہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں[1]"

ان مصیبت زدہ عورتوں، مردوں اور بچوں کو دیہات اور جنگلات میں ربح فرسا حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس پر مستزاد یہ کہ کھانا تو کیا پانی بھی میسر نہ آتا۔ ان نوع بہ نوع صعوبتوں اور کلفتوں نے لوگوں کا رنگ روپ بگاڑ دیا تھا، لباس چیتھڑے ہو کر لٹک گیا تھا اور ہر ایک شخص شدید جسمانی، ذہنی اور نفسی اذیتوں کا شکار تھا۔ شہر آشوبوں میں اس پراگندگی کا تذکرہ معلومات کا بیش قرار خزانہ ہے۔ تشنہؔ، سالکؔ، ظہیرؔ، داغؔ اور سوزاںؔ کے ایسے اشعار بہت موثر ہیں۔

دہلی کے لٹے ہوئے قافلوں کو مختلف مقامات پر مخبروں اور دیہاتیوں کے ہاتھوں جو تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں ــــــ ان نظموں سے ان کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ مخبر لوگوں کو ڈرا دھمکا کر بچی کھچی نقدی وصول کر لیتے ورنہ انہیں گرفتار

---

[1] خطوطِ غالب ص ۴۸

کرا دیتے۔ ان خستہ حالوں کے لیے دیہاتیوں اور مخبروں کی چیرہ دستیاں ایک نئی اور غیر متوقع آفت تھی۔ دو نظموں سے ایک ایک بند مثال کے طور پر درج ہے:

گرہ ٹٹولی کسی کی کمر پہ ڈالا ہاتھ　　ہر ایک مضطر و خستہ جگر پہ ڈالا ہاتھ
پدر کو چھوڑ دیا تو پسر پہ ڈالا ہاتھ　　جو سر برہنہ تھا اس کے سر پہ ڈالا ہاتھ
الٰہی ہاتھ نہ ٹوٹے ستم شعاروں کے
کہ ہاتھ دھو کے پڑے پیچھے خاکساروں کے

(تشنہؔ)

بچاؤ جان کے اس جان کی محبت میں　　گیا جو مضطربانہ کسی ریاست میں
تو گیر و دار سے آیا وہاں بھی آفت میں　　یہاں سے اور زیادہ پھنسا مصیبت میں
جو نقد کچھ ہے تو مخبر کا قرض دار بنا
وگرنہ بے گنہی میں گناہ گار بنا

(سالکؔ)

پوربی افواج کی مذمّت

شہر آشوبوں میں انگریزوں کی طرح پوربی افواج پر بھی شدید نکتہ چینی کی گئی ہے۔ پوربی افواج کا مقصد انگریزوں کو شکست دے کر بہادر شاہ ثانی کو با اختیار فرماں روا بنا دینا تھا۔ لیکن بعض شعرا نے انگریزوں کو بے دخل کرنے کی کوشش کو "سرکشی، گمراہی، زشتیِ اعمال، حرامکاری، نمک حرامی، محسن کشی، نادانی اور مذہب کی خلاف ورزی" سے موسوم کیا ہے۔ مثلاً ظہیرؔ کا اس مسلح کشمکش کے بارے میں یہ خیال ہے:

نہ دِین دار تھا کوئی، نہ دِین داری تھی   ستم پرستی و جور و جفا شعاری تھی
یہ پاسداریٔ ملت تو مستعاری تھی   پر اس کے پردے میں مکرِ حرام کاری تھی

غرض کہ دِین کو سمجھے تھے وہ ستم گاری
نمک حرامی و محسن کشی تھی دِیں داری

اس سلسلے میں یہ بات دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ پوربی افواج کے دہلی میں داخل ہو جانے سے اعلیٰ طبقے اور اس کے وابستگان کی پُرسکون زندگی میں خلل آ گیا تھا۔ ان فوجوں کے بعض منصوبوں سے اعلیٰ طبقے کے بہت سے افراد کو نقصان پہنچا تھا۔ اسی وجہ سے کچھ نظموں میں ان لوگوں کی آمد کو "قہر، بلا اور آفت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض شعرا مثلاً سالکؔ، سوزاںؔ، ظہیرؔ، داغؔ اور تشنہؔ نے تو ان پر صاف صاف قتل و غارت گری کا الزام لگایا ہے۔ مثلاً داغؔ لکھتا ہے:

غضب میں آئی رعیت بلا میں شہر آیا   یہ پوربی نہیں آئے، خدا کا قہر آیا

پوربی افواج کی اس مذمت کا ایک اور سبب بھی ہے۔ یہ شہر آشوب انگریزوں کی مکمل فتح کے بعد لکھے گئے۔ چناں چہ بعض شعرا نے کچھ تو ذاتی مفاد اور کچھ انگریزی سیاست کے خوف سے ان کے مخالفوں کو موردِ الزام ٹھہرانے کی کوشش کی۔

دہلی شہر کی تباہی

اس وقت دہلی شہر بھی دہلی والوں کی طرح تباہ ہوا۔ اس کو اس بُری طرح مسمار کیا گیا تھا کہ پورے پورے کوچے، محلے اور بازار نیست و نابود ہو گئے تھے۔ غالبؔ نے اس شکست و ریخت کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے:

"جامع مسجد سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اُٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے.... کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی۔ رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی؛ ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا... دِلّی واللہ اب شہر نہیں ہے، کیمپ ہے، چھاؤنی ہے؛ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔[1]"

محسنؔ لال قلعے کی بربادی کے بیان میں کہتا ہے:

ہوئی ہے ڈیوڑھی بنیاد کی بھی یہ برباد   کہ گویا پھینک دی اس کی اکھیڑ کر بنیاد
نشان بھی نہ رہا اس کا، اب کسی کو یاد   ہر ایک دیکھ کے بس اس کو، کرتا ہے فریاد

الٰہی کیا ہوئے سب یہاں کے ایواں و مکیں
فلک اُٹھا کے کہیں لے گیا ہے یہاں کی زمیں

ان نظموں سے اُس انہدام کی مکمل شہادت ملتی ہے اور کوچوں، محلوں، بازاروں اور مکانوں کے نیست و نابود ہونے کے اس بیان میں دلی رنج اور تڑپ کا عنصر موجود ہے:

مکان شکستہ ہیں مانندِ خاطرِ مایوس   اجاڑ کوچے، بسانِ دلِ الم مانوس
وہ شکل ہی نہ رہی، شہر ہو گیا معکوس   ستم کیا فلکِ بد شعار نے افسوس

---

[1] خطوطِ غالب ص ۲۶۷ — ۲۶۸

یہ وہ جگہ ہے جسے دیکھنے کو خلقت آئے
اور اب جو دور سے دیکھے کوئی تو غیرت آئے

(سالکؔ)

نہ رہا نام کو بھی نام و نشانِ دہلی　　مٹ گئے ہائے مکیں اور مکانِ دہلی

(کوکبؔ)

بسکہ بے داد سے ٹوٹے ہیں مکانِ دہلی　　ہو رقم خط شکستہ سے بیانِ دہلی

(صابرؔ)

ان شہر آشوبوں میں بعض جگہ نشاطِ رفتہ پر بہت زور ہے۔ ان حصوں کے مطالعے سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ لوگ ناز و نعم میں زندگی گزار رہے تھے۔ مثلاً مبینؔ کا بیان ہے:

یہاں کا روز تھا، ہر روز، روزِ عید جہاں　　یہاں کی شب تھی شبِ قدر رتبہ، نور افشاں
یہاں کی شام تھی جوں زلفِ عنبریں تاباں　　یہاں کی صبح تھی ہم نورِ عارضِ خوباں
یہ دہلی وہ تھی کہ اس سے جہان روشن تھا
یہ شہر وہ تھا کہ نام اس کا نورِ مخزن تھا

دراصل یہ خوش دلی، دلچسپی اور عیش و عشرت زیادہ تر حُسن پرستی اور حسن سے لُطف اندوزی تک محدود تھی۔ اسی وجہ سے ان نظموں میں جا بجا حسینوں کے اُجڑنے کا تذکرہ ہے۔

آزردہؔ، تشنہؔ، عیشؔ، عاقلؔ، عزیزؔ، مبینؔ، عباسؔ، مہدیؔ، ہنرؔ، سوزاںؔ، محسنؔ اور تجملؔ نے اس خصوصیت کا رنگین اور دل فریب انداز میں بیان کیا ہے۔ عیشؔ لکھتا ہے:

وہ پری زاد جنہیں دیکھ کے جان آتی تھی　　نام سے ان کے سنا، روح مزا پاتی تھی
بیٹھے بیٹھے جو طبیعت کبھی گھبراتی تھی　　ان سے ملتے تھے تو فوراً یہ بہل جاتی تھی
خاک میں ان کو، ہر ایک طرح ملایا اس نے
ہم جگر سوختوں کو اور جلایا اس نے

دہلوی زبان کی تعریف

اس وقت دلی کا سب سے بڑا کمال زبان دانی اور شاعری تھا۔ دہلوی زبان کی سادگی، فصاحت، شیرینی، دل نوازی، قبولِ عام اور اس کو مستند و معیاری سمجھے جانے پر اس طرح اظہارِ خیال کیا گیا ہے:

سخن وری میں تو دلی کی خاص شہرت تھی　　نثار اس پہ فصاحت، فدا بلاغت تھی
اسی کمال سے اس کی کمال عزت تھی　　زبانِ اہلِ زباں، دل پسندِ خلقت تھی
جما تھا سکہ جہاں میں زبانِ دہلی کا
بیان کس سے ہو حسنِ زبانِ دہلی کا

(وجاہتؔ)

کیا فصاحت کا کہوں حال کسی سے نہ سنی　　عرش سے فرش تلک مثلِ زبانِ دہلی

(احقرؔ)

کرتے ہیں لوگ جو دلی کی ارم میں باتیں　　حوریں سنتی ہیں بصد شوق زبانِ دہلی

(عابدؔ)

بند ہو جاتے ہیں شیرینیٔ الفاظ سے لب　　کیا زباں کھول سکیں مدعیانِ دہلی

(ظاہرؔ)

احمدِ پاک کی خاطر تھی خدا کو منظور　　ورنہ قرآن اُترتا بزبانِ دہلی